رجحان ساز غزل گو بہ حوالہ تصورِ مرگ و حیات

(فیضؔ تا مجروحؔ)

ڈاکٹر صائمہ شمس

Abstract:

The article entitled "Ruj'han Saaz Ghazal go, Ba hawala Tasawwur-e-Marg-o-Hayat", involves seven outstanding and trend setter Pakistani and Indian poets including, Faiz Ahmad Faiz, Israr-ul-Haq Majaz, Moen Ahsan Jazbi, Ali Sardar Jafferi, Jan Nisar Akhtar, Ahmad Shah Farigh Bukhari and Majrooh Sultan Puri respectively. In this article, the concept of 'Life and Death' in Urdu Ghazal is explored keeping in view every poet's own ndividual approach. In their poetry (Ghazal) this concept arise with different aspects of its canging meaning of respective time period and at the same time, in th perspective of their personal miseries.

اردو غزل کو ہمیشہ سے انتشار کا ماحول ملا اور آشوبِ حیات میں نشوونما کے مراحل طے کیے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جغرافیائی وحدت اگرچہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی مگر موضوعاتی اعتبار سے ہجرت اور فسادات کا تجربہ، سیاسی، معاشی اور اقتصادی تجربات و مشاہدات کے ساتھ ذاتی واردات کے اظہار کا ذریعہ بھی بنا۔ غزل کی ایمائیت میں نئے الفاظ، نئی علامات اور نئے استعارات کا اضافہ ہوا۔ گل و بلبل کی داستان سرائی کا زور کم پڑ گیا۔ پاکستان اور بھارت میں دونوں طرف جو خواب دیکھے گئے تھے، ان کی تعبیر کے لیے ایک طویل جدوجہد، غزل کے موضوعات میں شامل ہو گئی۔

> ''سیاسی رمزیت ہو یا ذات کا ارتکازی محور۔ معاملہ ہے عالمی وژن کا، حیات کے اس تصور کا جو جام شراب میں شفق کے عکس کی طرح جھلکتا ہے۔ بات منڈیر پر بیٹھی چڑیا کی ہو یا آسمان پر تیرتے بادل کے ٹکڑے کی۔ دونوں کے پیچھے دیکھنے والے کا انداز نظر ہی نہیں اس کی نظر بھی

ضرور نمایاں ہوگی اور اس نظر کے رشتے دور تک جائیں گے شخصیت سے ہو کر زمانے تک اور
زمانے سے ہوتے ہوئے زندگی کی طرف رویے تک'' ۱

ان حالات و واقعات میں اندازِ نظر کا فرق ہی، زندگی اور موت کو مختلف اور نئے نئے زاویوں سے دیکھنے کا سبب بنا۔

فیضؔ کا دور وطنیت، قومیت اور سیاست کے نئے تصورات کا عہد تھا۔ جہاں ان تصورات کے ساتھ ساتھ جمہوریت، اشتراکیت اور اشتمالیت وغیرہ کو بطور نظریۂ حیات اپنانے کی ایک آویزش بھی موجود تھی۔ اس کش مکش میں نظریاتی انتہا پسندی نے جگہ پائی۔ ادب اس دور میں سیاست، صحافت اور پروپیگنڈہ کا ایک ملغوبہ بن چکا تھا۔ فیضؔ کی زندگی کا یہ زمانہ، جوانی کی جذباتی اور ہیجانی زندگی سے بھرپور تھا۔ ابھی شعور نے اتنی پختگی حاصل نہیں کی تھی کہ زندگی کے اہم حقائق کو اپنے تجربے میں لاسکیں۔ محبت کا جذبہ ہی فیض کی ''صدائے حیات'' تھا مثلاً

ے
تمہاری ہر نظر سے منسلک ہے رشتۂ ہستی
مگر یہ دور کی باتیں کوئی نادان کیا سمجھے ۲

ے
سہل یوں راہ زندگی کی ہے
ہر قدم ہم نے عاشقی کی ہے
ہم نے دل میں سجا لیے گلشن
جب بہاروں نے بے رخی کی ہے ۳

مگر جلد ہی ملکی اور بین الاقوامی صورت حال نے فیضؔ کی تخلیقی شخصیت اور فکر کو ارتقا اور توسیع کی طرف مائل کیا اور فیض نے وطن اور جہان کے غم کو اپنا غم بنا لیا۔ پرانے جاگیردارانہ نظام کی بحالی کو فیضؔ نے تحریک پاکستان کے نصب العین سے انحراف اور نظریۂ پاکستان سے روگردانی قرار دیا۔ فیضؔ نے وطن دشمنی کے الزامات اٹھائے۔ مقدمہ سازش میں اسیری کا دور گزارا۔ سقوط ڈھاکہ سے ملک کا ناموس خاک میں ملتا دیکھا۔ سوویت یونین میں مستقل قیام کی پیشکش کو ٹھکرایا۔ مارشل لاء کی خبر سن کر فیض نے، منصور و قیس کی سنت زندہ کرنے کی ٹھان لی۔ اب پاکستان، فیض کی ''لیلیٰ'' بن گئی اور ''جانِ جہاں'' بھی۔ لندن میں قیام کے دوران تمام آسائشیں میسر ہوتے ہوئے بھی وطن کی یاد تڑپاتی رہی۔ مجازی عشق کی یہ رو آخر وطن دوستی اور انسانی دوستی کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بن گیا اور فیضؔ کا مرنا جینا وطن، اہل وطن اور دکھی انسانیت کے لیے محبت اور امن کی بازیافت کے لیے مقدر ہو گیا...... محبت میں ناکامی ہوئی تو ڈاکٹر رشید جہاں نے باور کرایا کہ یہ حادثہ ذات واحد کا بڑا حادثہ تو ہو سکتا ہے مگر اتنا بڑا دکھ نہیں کہ زندگی بے معنی ہو جائے اور ان کے مشورے پر کارل مارکس کی کیمونسٹ مینی فسٹو کا مطالعہ، فیضؔ کی زندگی کا ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ ادب اور معاشرے کی تعمیرِ نو کے لیے فیضؔ کے اندر ایک اجتماعی احساس نے جنم لیا۔ فیضؔ نے ایک مقام پر کہا تھا کہ

''نظامِ زندگی کسی حوض کا ٹھہرا ہوا، سنگ بستہ، مقید پانی نہیں ہے جسے تماشائی کی ایک غلط انداز نگاہ احاطہ کر سکے۔ دور دراز اوجھل دشوار گزار پہاڑیوں میں، برفیں پگھلتی ہیں، چشمے ابلتے ہیں، ندی نالے پتھروں کو چیر کر، چٹانوں کو کاٹ کر آپس میں ہم کنار ہوتے ہیں اور پھر یہ پانی کٹتا بڑھتا، وادیوں، جنگلوں اور میدانوں میں سمٹتا اور پھیلتا جاتا ہے۔ جس دیدۂ بینا نے انسانی تاریخ میں یم زندگی کے یہ نقوش و مراحل نہیں دیکھے اس نے دجلہ کا کیا دیکھا ہے...... حیات انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک، اور اس جدوجہد میں حسب توفیق شرکت، زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے۔ فن اسی زندگی کا ایک جزو اور فنی جدوجہد اسی جدوجہد کا ایک پہلو ہے۔ یہ تقاضا ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ اس لیے طالب فن کے مجاہدے کا کوئی نروان نہیں۔ اس کا فن ایک دائمی کوشش ہے اور مستقل کاوش...... کوشش کیسی بھی حقیر کیوں نہ ہو، زندگی یا فن سے فرار اور شرمساری پر فائق ہے''۴؎

یہی کوشش اور مجاہدہ فیض کا وظیفۂ حیات بنا اور شاعری اور زندگی کا خاصا بھی۔ اب ناکامی عشق کی سرحدیں، بنی نوع انسان کے بے کراں دکھوں اور محرومیوں سے مل گئی تھیں۔ بے کسوں کی آنکھوں کے اشک، ''ناتوانوں کے نوالوں پر جھپٹتے ہوئے عقابوں کا منظر''، ''بازار میں مزدور کا گوشت بکتا ہوا اور شاہراہوں پر غریبوں کا لہو بہتا ہوا''، فیض کے سینے میں ایک آگ لگا دیتا ہے۔ مفلوک الحال اور غریب محنت کش سے ایک تعلق خاطر پیدا کر دیتا ہے۔ فیض کے والد سلطان بخش، کالا قادر کے ایک نادار کسان گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جنھوں نے ایک چرواہے اور قلی کے طور پر بھی کام کیا لیکن بعد ازاں مجاہدہ اور کوشش سے انگلستان میں افغانستان کے سفیر اور بیرسٹر بنے۔ اس اعتبار سے فیض نے اپنے مقدر کو غریب عوام کے مقدر سے وابستہ کر کے بہتر زندگی کی جدوجہد ساری عمر جاری رکھی۔

فیض نے کینیا اور دیگر افریقی ممالک کے حریت پسندوں کی آواز سے آواز ملائی۔ ایران کے قید خانوں میں وطن پرستوں کے ساتھ جو حال ہوا، فیضؔ نے ایرانی طلبا کی شہادت کا نوحہ لکھا۔ اسرائیلی جبر و استبداد کے مقابلے میں فلسطینی مجاہدین آزادی کی برسوں پر محیط قربانیوں کے درد بھرے نوحے لکھے۔ سرد جنگ کے زمانے میں، امن عالم کے مجاہدوں کو کچلا جا رہا تھا۔ ایتھل اور جولیس روزنبرگ بھی امن عالم کے شہدا میں شامل ہو گئے۔ اب فیض کی زندگی اور شاعری کی جہت آفاقی ہو گئی تھی۔

''......وہ دور افق پر زندگی اور توانائی کی اٹھتی، گرتی، گھٹتی، بڑھتی روشنی دیکھ رہے ہیں......''۵؎

فیض کا مجاہدہ، رجائیت اور حوصلہ مندی سے مملو ہے۔ نامساعد حالات میں بھی زندگی کے آثار قائم رہتے ہیں۔ ذات سے کائنات تک کے اس سفر میں فیضؔ یقین کا علمبردار ہے مثلاً۔

؎ فیض زندہ رہیں وہ ہیں تو سہی
کیا ہوا گر وفا شعار نہیں ۶؎

میری جان آج کا غم نہ کر کہ نہ جانے کا تب وقت نے
کسی اپنے کل میں بھی بھول کر، کہیں لکھ رکھی ہوں مسرتیں ۷؎

حلقہ کیے بیٹھے رہو اک شمع کو یارو
کچھ روشنی باقی تو ہے ہر چند کہ کم ہے ۸؎

جان باقی ہے تو کرنے کو بہت باقی ہے
اب وہ جو کچھ کہ مری جاں نہیں کرنے دیتے ۹؎

بہت ملا نہ ملا، زندگی سے غم کیا ہے
متاعِ درد بہم ہے تو بیش و کم کیا ہے ۱۰؎

فیضؔ کا غم بھی، سحر کا یقین ہے، زندگی کے حالات و واقعات اور حادثات میں بھی فیضؔ یقین کی اس دولت سے مالا مال رہے۔ بیگم ایلس فیض کے ۱۹۴۷ء میں زیورات چوری ہوئے تو چہرے پر احساسِ محرومی دیکھ کر فیض نے ایلس کا حوصلہ یہ کہہ کر بڑھایا کہ ع رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

یہ یقین زندگی کو برتنے کا ایک مثبت انداز ہے جو فیضؔ کی شخصیت اور غزل کا حصہ رہا ہے۔ ازدواجی زندگی میں بھی رنج و ملال کے جو مواقع آئے بقول بیگم ایلس فیض، ان کو بہن، بھائی، عزیزوں اور محبوب دوستوں سے جدا ہوتے دیکھا مگر ان میں غم کو برداشت کرنے کا بہت حوصلہ تھا۔ ان کی جبین شکن آلود نہ ہوتی اور ایک ایسی رجائیت پیدا ہوگئی تھی جو محض موضوعی نہ تھی بلکہ ان کا فلسفۂ حیات بن گئی تھی اور اس کا آئینہ ان کی امیدیں ہیں اور مسلسل جدوجہد۔ فیض نے اپنے عہد کی ہر طرح کی بدصورتی کے خلاف احتجاج کیا اس احتجاج میں امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔

ے چل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبض ہستی
دونوں عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے ۱۱؎

(اے دل بے تاب ٹھہر۔ دستِ صبا)

ے کوئی پکارو کہ اک عمر ہونے آئی ہے
فلک کو قافلۂ روز و شام ٹھہرائے
صبا نے پھر در زنداں پہ آ کے دستک دی
سحر قریب ہے، دل سے کہو نہ گھبرائے ۱۲؎

فیض کا موضوع انسان اور محبت اور امن میں تبدیل ہوگیا۔ اور اس کا آدرش ہزیمت زدہ افراد سے محبت اور امن کے گیت گانا بن گیا۔

> ''اس کی شاعری میں زندگی کی جو تصویر پیش کی گئی ہے اس میں حال کا نقش بھی ہے اور مستقبل کے امکانات بھی ہیں۔ اس لیے اس کے یہاں ''زندگی جیسے ہونا چاہیے'' کا تصور موجود ہے اور

یہیں وہ ان قوتوں کے خلاف مزاحمت کا سبق دیتا ہے جو زندگی کے نصب العین یا آدرش کے حصول میں رکاوٹ ہیں۔ فیض کی مزاحمت ایک فرد کے خلاف نہیں اس طرزِ حیات...... کے خلاف ہے جو شرفِ آدمیت کی بحالی، عدلِ اجتماعی، مساوات اور بنیادی انسانی حقوق کی پامالی کرتا''۱۳؎

اور اس نصب العین کے لیے فیض کی آواز میں عزم کی پختگی قابلِ تحسین ہے۔

؎ ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے ۱۴؎

ارادے کی یہی پختگی ''درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر'' لگنے پر بھی، ''دل میں ستارے'' اتارتی ہے۔ مجموعی حیثیت سے

''فیض کی نظر میں ہر وہ شے گھناؤنی، بدصورت، سزاوارِ نفرین و ملامت ہے جو زندگی کے حسن کو مجروح کرے، جس سے محبت کا خون ہوتا ہو اور جس کے باعث انسان کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے کا مناسب موقع نہیں ملتا''۱۵؎

''دستِ تہہ سنگ'' میں فیض نے امن اور آزادی کو زندگی کے حسن و خوبی کی شرطِ اول قرار دیا ہے۔ اور ان کی راہ میں حائل تمام مزاحم قوتوں سے برسرِپیکار ہونے کا حوصلہ رکھتا ہے۔

''یہی نشاط خیز لہجہ اور یہی رجائی آہنگ فیض کے تمام کلام میں جاری و ساری نظر آتا ہے۱۶؎''

....

فیض نے جس انسان دوستی کو اپنا آدرش بنایا اس کے تقاضے جان کی قربانی بھی مانگتے تھے۔ فیض نے دل کے بجائے اب جان کا سودا منظور کر لیا تھا۔ انسان، محبت اور زندگی کے لیے جان کا نذرانہ پیش کرنا تھا۔ ''اس کی ہر راہ مقتل سے گزر کر جانے والی'' تھی۔ زنداں میں بھی موت کے سائے منڈلا رہے تھے۔ سکاؤٹوں کے مرنے پر بھی، اپنی باری کے لیے تیار رہنے کا مجاہدہ، فیض نے حوصلہ مندی سے کیا۔ اپنوں کی ستم ارزانی، بے گناہوں کی گرفتاریاں، قید و بند کی سختیاں موت کی طرف دھکیل رہی تھیں۔ فیض کی اردو غزل میں

۱) موت ایک ناگزیر حقیقت ہے۔
۲) موت کی شان اور شکوہ، جان کی بازی لگانے والے کو بھی پُرعظمت بنا دیتی ہے۔
۳) موت کی پیش قدمی کی چاپ، زندگی کے قدم بہ قدم سنائی دیتی ہے۔

مذکورہ تینوں امور پر درج ذیل منتخب اشعار کو مثال کے طور پر یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ

؎ ہر اک قدم اجل تھا، ہر اک گام زندگی
ہم گھوم پھر کے کوچۂ قاتل سے آئے ہیں ۱۷؎

؎ جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جان کی تو کوئی بات نہیں ۱۸؎

ے مقام، فیض، کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے ۱۹

یہ تصورات فیضؔ کے ''عالم تنہائی'' اور ''قید تنہائی'' کا پس منظر بھی رکھتے ہیں۔

''فیض نے بیشتر زندگی ''آؤٹ سائڈر'' (Out Sider) کی حیثیت سے گزاری ہے۔ وہ بھری محفل میں بھی گھنٹوں چپ رہتے تھے۔ جیسے وہ عالم تنہائی میں ہوں۔ پھر سچ مچ کی تنہائی بھی ان پر اکثر مسلط رہتی تھی...... ''قید تنہائی''۔ جب وہ جیل سے باہر آتے تو انہیں کہیں بھی فرد آزاد نظر نہ آتے کہ ان سے ہم کلام ہوں۔ لوگوں کی زبان ہی کچھ اور ہو گئی تھی۔ ان کی آوازوں میں سکوں کی کھنک سنائی دیتی تھی۔ تحریک آزادی کی سرخروئی نے لوٹ مار کا بازار کھول دیا تھا...... یوں لگتا ہے کہ زندگی حبسِ دوام ہے۔ ایسے ''زنداں خانے'' میں ہیں جہاں کوئی ملاقات نہیں آتی۔ ارباب اختیار نے ہر ملاقاتی کو بھی پابہ زنجیر کر رکھا ہے...... بس ایک ہی ''ملاقات'' جس کا شاعر کو انتظار ہے...... موت ہے...... یہی آشنا اور غم خوار بچی ہے اور کوئی بھی نہیں، کوئی بھی نہیں'' ۲۰

ے ضبط کا عہد بھی ہے شوق کا پیمان بھی ہے
عہد و پیماں سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے
درد اتنا ہے کہ ہر رگ میں ہے محشر برپا
اور سکوں ایسا کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے ۲۱

یہ ضبط، فیض کی زندگی اور موت کے ہر ابتلا کی جان رہا ہے۔ زندگی کے آلام اور موت کے عزائم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فیض نے موت کا سامنا کیا۔

''فیض میں یہ ضبط وتحمل اور یہ اعتماد اذیت کوشی اور موت سے نبرد آزمائی کی بدولت پیدا ہوا ہے۔ ایک ایسی موت جو جدوجہد کے لیے خود کو وقف کر دینے والے کے لیے ناگزیر ہوتی ہے'' ۲۲

موت کی آہٹ سن کر اس کا استقبال یوں کیا ہے۔

ے پُر کرو جام کہ شاید ہو اسی لحظہ رواں
روک رکھا ہے جو اک تیر قضا نے کب سے ۲۳

ے اجل کے ہاتھ کوئی آ رہا ہے پروانہ
نہ جانے آج کی فہرست میں رقم کیا ہے ۲۴

فیض کا خیال ہے کہ زندگی ہو یا موت، دونوں کا فیصلہ کن ہونا ضروری ہے۔ اس لیے کہا۔

یا خوف سے در گزریں یا جاں سے گزر جائیں
مرنا ہے کہ جینا ہے اک بات ٹھہر جائے ۲۵

اسی لیے فیض کا لہجہ بھی اسی تصور کی دین ہے۔

''فیض نے چونکہ غازی اور مجاہد کی سی زندگی بسر کی ہے اس لیے اس کی شاعری کا بنیادی لحن شہید کی صداء ہے...... اپنے عہد میں سنت شبیر اور سنت منصورؒ کو زندہ کرنا...... اپنی فکری روایت کی اعلیٰ ترین قدروں کے مطابق زندگی بسر کرتے ہوئے فن کی کھیتی کو اپنے لہو سے سیراب کرنا ہے...... فیض کے اشعار، مصرعے اور استعارے اخبارات کی سرخیاں اور ادارتی کالموں کے عنوانات بن کر ہمارے شعور زندگی کے ہاتھوں میں مشعلیں تھماتے رہے اور آج شہید کی صدا کا یہ لحن ہماری شاعری ہی کا نہیں بلکہ ہماری زندگی کا بھی بنیادی لحن بن چکا ہے'' ۲۶

تاریخ بتاتی ہے کہ روس کے عہد انقلاب کے 'یزنین' نامی نوجوان شاعر نے انتہا پسند تشدد سے جان چھڑانے کے لیے تیس برس کی عمر میں پھانسی لگا لی اور اپنے فن پر زندگی کو قربان کر دیا۔ فیض نے بھی طبقاتی جنگ میں شکستہ زندگی کے بجائے پختہ موت کے لیے تیاری جاری رکھی۔

....

مجاؔز کی بہن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''مجاز میرا بھائی ایک ڈرامائی انداز سے اس زندگی میں ابھرا اور اسی انداز سے ڈوب گیا۔ اس کی زندگی امنگوں، حوصلوں سے بھرپور شروع ہوئی اور محرومیوں، مایوسیوں میں گھر کر ختم ہو گئی۔ وہ زندگی کو روشن تر دیکھنے کی تمنائیں پالتا رہا اور اس کی اپنی زندگی دھیرے دھیرے تاریک تر ہوتی گئی۔ اس نے زندگی کو اپنی تخلیقی قوتوں کا قیمتی سرمایہ سونپا۔ اپنی شاعری دی جس میں کائنات کو حسین بنانے کے حوصلے ہیں مستقبل کو سنوارنے کی امنگیں ہیں۔ جوانی کی جولانی ہے۔ تجربہ کی ہوشمندی ہے۔ شوریدہ سری ہے حسن ہے نفاست ہے۔ سادگی ہے پرکاری ہے اور زندگی نے اسے پریشانیاں دیں۔ پشیمانیاں دیں۔ الجھنیں دیں۔ بے چینی دی۔ وہ زندگی سے محبت مانگتا ہے۔ مسرت مانگتا ہے۔ سکون چاہتا ہے اور زندگی رفتہ رفتہ اس سے دور کھنچتی گئی۔ یہاں تک کہ زندگی کی کھیتی کو خون دل سے سینچنے والے شاعر کو موت کی آغوش میں پناہ ملی'' ۲۷

یہ ہے ایک شخص اور شاعر کی داستان حیات جس کا ورق ورق اس کی شخصیت کی طرح الجھا ہوا ہے۔ کبھی کسی کے نام کی مستی اس کی زندگی کے سادہ خاکے کو رنگین کر دیتی ہے اور اس کی دنیا حسن ہی حسن بن جاتی ہے اور کبھی وہ آپ اپنی شکست کی آواز بن جاتا ہے۔ دونوں دنیاؤں کا تعارف مجاؔز نے ان اشعار میں کروایا ہے۔

ے یہ میری دنیا یہ میری ہستی
نغمہ طرازی صہبا پرستی
شاعر کی دنیا شاعر کی ہستی
یا نالۂ غم یا شورِ مستی
محو سفر ہوں، گرمِ سفر ہوں
میری نظر میں رفعت نہ پستی ۲۸

اودھ کے قصبہ رودلی میں پیدا ہونے والے مجازؔ کی زندگی اور اردو غزل میں بھی نالہ غم اور شور مستی کا امتزاج ہے۔ اس کے ماحول میں بھی جاگیرداری نظام کی خوبیاں بھی تھیں اور خامیاں بھی۔ تہذیبی زندگی کا سلیقہ بھی تھا اور اس کے بگڑتے نقوش بھی تھے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے مجازؔ کی ایک غزل کے حوالے سے اسی ماحول کی تصویر اس طرح پیش کی ہے۔

''آج مجاز کی نئی غزل سنی ہے جو کسی مشاعرے کے لیے طرح میں کہی ہے، بڑی انکساری اور معذرت کے ساتھ سنائی۔

ے بس اس تقصیر پر اپنے مقدر میں ہے مر جانا
تبسم کو تبسم کیوں نظر کو کیوں نظر جانا
خرد والوں سے حسن و عشق کی تقصیر کیا ہو گی
نہ افسون نگہ سمجھا نہ انداز نظر جانا
مے گل فام بھی ہے ساز عشرت بھی ہے ساقی بھی
مگر مشکل ہے آشوب حقیقت سے گزر جانا
غمِ دوراں میں گزری جس قدر گزری جہاں گزری
اور اس پر لطف یہ ہے زندگی کو مختصر جانا

یہ لکھنوٴ ہے یہاں کی اجڑی ہوئی صحبتوں کا یہ گداز، یہ لطافت اور شیرینی اور کہاں ملے گی یہ اجڑی ہوئی بیوہ کا سہاگ ہے جس کے لاکھ لٹ جانے پر بھی غضب کا نکھا رہے۔ سردی کی پچھلی راتوں کی چاندنی، ڈھلتی ہوئی دھوپ اور گل نغمہ جو آپ اپنی شکست کی آواز ہے''۲۹

وہ ''راہبر کامل'' کی تلاش میں نہیں بلکہ ''مانوس مزاج دل'' کا متلاشی ہے۔ زندگی کا دوہرا پن ہر قدم پر اس کا سامنا کرتا ہے اس کا خاندان بھی دو حصوں میں تقسیم تھا۔ ایک قدیم روایات کا پیروکار اور دوسرا جدید اقدار کا حامی۔ باپ سے حقیقت پسندی اور ماں سے اثر پذیری مجازؔ کے حصے میں آئی جو دو مختلف مزاجوں کا ملاپ تھا۔ دو اڑھائی سال کا ایک بھائی فوت ہوا تو مجازؔ کی پرورش میں لاڈ کا عنصر زیادہ پیدا ہو گیا۔ مجازؔ کی عمر دس سال کے لگ بھگ تھی کہ بڑا بھائی درخت سے گر کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تو والدہ اور نانی کی ساری توجہ مجازؔ کی طرف مبذول ہو گئی۔ بچپن میں

کھلونے توڑ کر چیزوں کی ماہیت معلوم کرنے والا دوسری جانب ایک اچھا تیماردار بھی تھا۔ مضامین کے انتخاب میں بھی بار ہا تبدیلی کے عمل سے گزرنا مزاج اور شخصیت کے الجھاؤ کا سبب بنا۔ محبت کی مگر ۱۹۴۰ء میں نتیجہ، نروس بریک ڈاؤن کی شکل میں سامنے آیا۔ زندگی کے تار منتشر ہوتے رہے اور ساتھی بھی بکھرتے رہے۔ ۱۹۴۵ء میں دیوانگی کا دورہ پڑا۔ بیماری اور تنہائی یکجا ہو گئیں۔ اندر باہر احساس محرومی نے بسیرا کر لیا۔ ۱۹۵۲ء میں تیسرا نروس بریک ڈاؤن ہوا۔ بہن کے انتقال اور اس کے بچوں کی ذمہ داری نے مجاؔز کو زندگی کی آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔

> ''مجاز جو کہ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے ہندوستان کے اس درمیانے طبقہ کے نوجوانوں کے نمائندے ہیں جو زندگی کے سارے جھمیلوں بندشوں اور رکاوٹوں کا شکار ہوتے ہوئے بھی جی توڑ کر ان سے کشتم کشتا کر رہے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے یہ کانٹے چبھتے ہیں اور ان کی نوک پر وہ اپنا سینہ ٹیک دیتے ہیں...... ہاتھ روٹی کمانے میں الجھے ہوئے ہیں۔ پیر غلامی کی زنجیروں میں گھسٹ رہے ہیں۔ ایک نہیں سو ہزار آسیب جان کو چمٹے ہوئے ہیں اور حساس طبیعت ناک پر مکھی بٹھانے کو تیار نہیں۔ ایسی صورت میں شاعری بجائے داستان حسن و عشق کے معجون مرکب نہ بن جائے تو اور کیا کرے۔ یہی وجہ ہے کہ مجاز کے یہاں عشق و سیاست باہم کھوئے ہوئے نظر آتے ہیں بھلا اتنی مجبوریاں ہوں تو کوئی کیونکر جیئے''۳۰

مجاؔز کی غزل میں محبت اور سیاست کے یہ بدلتے انداز واضح ہیں۔

ے اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں، اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصل بہاراں رخصت ہو، ہم لطف بہاراں بھول گئے ۳۱

ے عشق سے بے نیاز ہیں ہم لوگ
بے خود سوز و ساز ہیں ہم لوگ
محفل سوز و ساز ہے دنیا!
حاصل سوز و ساز ہیں ہم لوگ ۳۲

مجاؔز نے ''سوز و ساز'' کی اس دنیا سے دونوں اثرات لیے اور زندگی کے تقاضے پورے کرنے کے لیے رومانیت کے ساز اور حقائق کے سوز سے کام لیا اور حیات کی وسعتوں میں اضافہ کیا ہے۔ مجاؔز کی ذاتی اور سماجی زندگی کا سارا نقشہ اور اردو غزل کو سامنے رکھ کر یہی کہا جا سکتا ہے کہ

> ''یہ درست ہے کہ اگر سماجی رکاوٹوں کو توڑ کر حسن اور عشق ہم نوا اور ہم آغوش ہو جائیں تو زندگی کا نقشہ بدل سکتا ہے لیکن اگر ایسا نہ ہو سکے تو جوش حیات اور جنون تعمیر کو ختم نہیں ہو جانا چاہیے۔ مجاز نے ان خیالات کو جن شاعرانہ رنگ آمیزیوں کے ساتھ پیش کیا ہے انہوں نے حقائق کو زیادہ سنگین اور پراثر بنا دیا ہے''۳۳

زندگی کی اس تاثیر کا اردو غزل سے ایک اور نمونہ

؎ سعی تدبیر میں مضمر ہے اک آہِ جاں سوز
اس کا انعام سزا ہو کہ جزا ہو ساقی ۳۴

بقول ڈاکٹر نعیم نقوی:

''مجاز کی زندگی دو متضاد کیفیتوں کے تسلسل سے عبارت رہی ایک کیفیت کو تاج محل اور دوسری کو تیشۂ مزدور کہا جا سکتا ہے...... ہوا یہ کہ حسن کے دہکتے ہوئے شعلوں اور مزدوروں اور کسانوں کی مفلسی کی دو آتشہ آگ نے ان کی ہستی کو کندن بنا دیا۔ وہ آگ میں سانس لینے لگے آگ کے شعلوں سے دل بہلانے لگے'' ۳۵

گویا مجازؔ نے ''سوز حیات'' کی ہولناکیوں کو بھی برداشت کیا اور ''ساز حیات'' میں بھی زندگی آموز آوازوں کو غور سے سنا۔ تقدیر کے زور سے بے پروا ہو کر کاوش تدبیر پر توجہ دی۔ انقلاب کے تعمیری اسباب اور نتائج پر نظر رکھی۔ آنچل اور پرچم کو ایک جگہ دیکھنے کی تمنا کی۔ مجازؔ نے ذہن انسانی کے اس ارتقا پر بھی غور کیا کہ وہ ''اوہام کے ظلمات میں'' اور ''زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں'' ''خواب سحر'' تو دیکھتے ہیں۔

''عام نوجوان شعراء کی غنایت زندگی سے بیزار اور موت سے وابستہ ہے۔ انہیں زندگی کی لذتوں کی آرزو نہیں، موت کے سکون کی ہوس ہے۔ مجاز گرم زندگی کے نشے سے چور اور موت کے سرد جمود سے سراسر بیزار ہے

؎ مجھے پینے دے، پینے دے کہ تیرے جام لعلیں میں!!
ابھی کچھ اور ہے، کچھ اور ہے، کچھ اور ہے ساقی'' ۳۶

وہ ''تیغ کے بوسے'' میں ''آب'' پیدا کرنے کا خواہاں ہے۔ وہ ہر حال میں زندگی کی مشاطگی کو تیار ہے۔ اس اعتبار سے مجازؔ کا تصور حیات ''دعوت نظر'' بھی ہے اور ''دعوت فکر'' بھی۔ مجازؔ کی اردو غزل میں زندگی اور موت ایک دوسرے کے قدم بہ قدم ہیں بلکہ ایسے جیسے سوز و ساز حیات پہلو بہ پہلو ہیں۔

؎ وقت کی سعی مسلسل کارگر ہوتی گئی
زندگی لحظہ بہ لحظہ مختصر ہوتی گئی!!

؎ سانس کے پردوں میں بجتا ہی رہا ساز حیات
موت کے قدموں کی آہٹ تیز تر ہوتی گئی ۳۷

موت کی تیز تر آہٹ کے ساتھ زندگی کی نغمگی میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اس طرح موت کسی بھی طرح زندگی کے مظہر سے الگ حیثیت نہیں رکھتی۔ مجازؔ دوسری دنیا میں زندگی کے کسی بھی تصور سے بیزار ہے اس لیے واعظ کی حیات بعد ممات کے وعدوں کو اس کی ''سادہ لوحی'' سے تعبیر کیا ہے۔

؎ واعظ سادہ لوح سے کہہ دو چھوڑے عقبےٰ کی باتیں
اس دنیا میں کیا رکھا ہے اس دنیا میں کیا ہو گا ۳۸؎

اس فکر کو مجازؔ کی شاعری کے پس منظری مطالعہ کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ اس کے عہد کی زندگی اور اس کی روش کی توضیح بھی ہے۔

''جس وقت تک ساغر حیات مئے زیست سے لبریز ہاتھوں ہاتھ ہوتا ہے یہ زندگی فطرت کا نغمہ اور سچائی کا آئینہ رہتی ہے۔ لیکن جب ہاتھوں ہاتھ کاسۂ گدائی ہو اور ظالم کا خمخانۂ عیش خون استحصال سے پر ہو تو پھر یہ زندگی عوام کے لیے دکھ درد کا کارخانہ یا پھر منفی ردعمل میں مایا کا جنجال اور کچھ نہ ہونے کا حیرت خانہ ہے۔ ماضی میں اسی منفی ردعمل نے ہم سے قوت فکر کے ساتھ ساتھ قوت پیکار بھی چھین لی تھی۔ اور زندگی کی جگہ دوسری دنیا میں وعدہ زیست دے رکھا تھا۔ مجاز دور جدید کے ان شعراء میں سے ہے جنہوں نے دوسری دنیا کے وعدہ زیست کو اسی زمینی زندگی میں نقدی کرنا چاہا۔ شیخ و برہمن کانپے، محتسب چونکا۔ لیکن وہ اندھیری رات کا مسافر خواب سحر دیکھ گیا اور دکھلا ہی گیا۔'' ۳۹؎

....

معین احسن جذبیؔ کا امتیازی وصف یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باوجود اپنی درویشانہ طبیعت کو مغلوب نہیں ہونے دیا۔ یہ وہ دور تھا جب غزل کی صنف مخالفت کی زد میں تھی مگر جذبیؔ نے نہ صرف اس کی حمایت کی بلکہ زمین کے ساتھ اس کے گہرے تعلق کو اور مستحکم کیا۔ غزل کے مضامین کو ذہنی بیداری کا ذریعہ بنایا اور اپنے عہد کے تقاضوں کو اپنی غزل میں جگہ دے کر غزل کے مستقبل اور وسعت کے امکانات کو روشن کیا۔ جذبیؔ کی اردو غزل میں کہیں کہیں افسردگی کے لمحات بھی دکھائی دیتے ہیں اور کائنات اور زندگی کو بنظر حقارت بھی دیکھا ہے مگر یہ سب کچھ لمحاتی ہے۔ بدلتے دنوں کا احساس غزل میں ایک رجائیت پیدا کرتا ہے۔ سختی روز و شب جو فسردگی پیدا کرتی ہے اس میں بھی ایک شان ہے۔

؎ فسردگی ہی جو ٹھہری ہے زیست کا حاصل
تو پھر یہ زیست کا حاصل رہے رہے نہ رہے ۴۰؎

رومانیت اور ترقی پسندی کا امتزاج بھی ایسا کہ کسی ایک کے زیر اثر کبھی مکمل طور پر خود کو نہ آنے دیا۔

؎ ابھی پڑی تھی خم و پیچ زندگی پہ نظر
کہ ان کی زلف شکن در شکن کی یاد آئی ۴۱؎

حیات کی جفائیں، سختیاں اور آفات شاعر کی شخصیت اور غزل کو ایک پختگی اور توانائی بخشتی ہیں۔ وہ یقین کی دولت سے مالا مال ہے۔

ے ''شکست و فتح نصیبوں'' سے اب نہیں جذبی
کہ آج ہے دل ہر ناتواں میں عزم و یقین ۴۲

۱۹۴۲ء میں دوسری جنگ عظیم، ۱۹۴۹ء کے اندوہناک حالات، ملک کی آزادی کے بعد استحصال، بھوک، قحط، انسانیت کا قتل عام وغیرہ میں بھی جذبیؔ نے انتہائی شائستگی کے ساتھ زندگی پر غور وفکر کی دعوت دی ہے۔

ے سب کچھ نصیب بھی ہو تو اے شورش حیات
تجھ سے نظر چرانے کی عادت کہاں سے لائیں ۴۳

ے ہر سانس انتشار فراواں سے بے قرار
اس کارواں سے کیا کوئی رہزن قریب ہے ۴۴

جذبیؔ کے یہاں عصری شعور اور نئی معنویت کی تصویر پیش کرنے میں جن علامتوں سے کام لیا گیا ہے اس کی مثال وارث کرمانی نے یوں پیش کی ہے۔

''ان کے اشعار میں ہم عصر سماجی و سیاسی افکار غزل کی قبائے خسروانہ پہن کر ظاہر ہوتے تھے۔ رچے اور ترشے ہوئے انداز بیان اور متقدمین شعرا کے علائم و رموز کی آڑ لے کر انہوں نے نئے تصورات و احساسات کو پیش کیا اور اس طرح تھکی ہوئی غزل کو عصری آگہی اور نئی معنویت سے سرشار کیا......لینن کے اس خیال کو کہ سرمایہ دارانہ طاقتیں پس ماندہ ملکوں کے استحصال میں خود آپس میں ٹکرائیں گی۔ انہوں نے ایک شعر میں ادا کیا ہے:

ے ان بجلیوں کی چشمک باہم تو دیکھ لیں
جن بجلیوں سے اپنا نشیمن قریب ہے

انہوں نے سلیس و فصیح زبان میں نئے افکار ونظریات پیش کیے اور ایسے مشاہدات و تجربات کو گویائی عطا کی جو وقتی اثرات سے بلند ہو کر زمانے کی آواز بن سکتے ہیں:

ے جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

ے ہے آج بھی نگاہ محبت کی آرزو!!!
پر ایسی اک نگاہ کی قیمت کہاں سے لائیں
ہر لحظہ تازہ تازہ بلاؤں کا سامنا
ناآزمودہ کار کی جرأت کہاں سے لائیں
اس افق کو کیا کہیئے نور بھی دھندلکا بھی
بار ہا کرن پھوٹی بارہا غبار آیا'' ۴۵

ان حالات کے باوجود جذبی نے زندگی کی تازگی اور شگفتگی کو برقرار رکھنے کی سعی کی ہے۔ اور ہر حال میں کائنات کی دھڑکن میں خود کو شامل رکھا ہے۔ زندگی پر آنچ نہیں آنے دی۔ رجائیت کو قائم رکھا ہے۔ اور زندگی کی آرزومندی سے دستبردار نہیں ہونے دیا۔

ے دانائے غم نہ محرم راز حیات ہم!!
دھڑکا رہے ہیں پھر بھی دل کائنات ہم [۴۶]

ے ہمیں تو ناصح ناداں شرار زیست سے کام
تصادم نگہ و دل رہے رہے نہ رہے [۴۷]

زندگی کے ساتھ مخلصانہ رویے نے تہذیب اور زندگی کے روشن پہلوؤں کو جذبی کی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا اور جذبی کی غزل ابہام سے بچی رہی۔

''جذبی کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شخصیت کو ٹوٹنے اور بکھرنے نہیں دیا اور تشکیک و بددلی کی وادیوں سے دامن بچا کر نکل آئے۔ مغرب کا مادہ پرستانہ اور سیکولر طرز فکر ان کے مزاج کا حصہ نہ بن سکا۔ جن چیزوں کو ان کے ہم عصر جھوٹی و کھوکھلی رجائیت قرار دیتے رہے ان کے نزدیک وہ اپنی جڑوں سے رشتے قائم رکھنے کا معاملہ تھا۔ جذبی خارزاروں سے گزر کر دامن صحیح وسلامت لے آئے یہی ان کا کمال ہے'' [۴۸]

موت کے آثار اور خوں فشاں مناظر میں بھی جذبی نے تازہ جہاں تلاش کر لیے۔

ے یوں گوارا ہے یہ خونبار افق کا منظر
اس کے پرتو میں ہمیں تازہ جہاں ملتے ہیں [۴۹]

زندگی ہو یا موت، ایک پروقار خوداعتمادی کی رو میں کوئی رکاوٹ نہیں۔

....

علی سردار جعفری کی اردو غزل میں زندگی کی وہ قوت، جوش اور جذبہ پایا جاتا ہے، جو فرسودگی اور پژمردگی کے خلاف، ایک مظاہرے کی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔ ان کو سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں اپنے شہر سے نکل کر لکھنؤ اور پھر علی گڑھ کے سیاسی اور کھلے ماحول میں آزادی کی فضا میسر ہوئی تو باغیانہ خیالات کے اظہار کا موقع فراہم ہوا۔ بچپن میں رات کو مطالعہ کرنا اور بہن سے کوئی کتاب سننا اور تھک کر سو جانا علی سردار جعفری کے معمولات میں شامل تھا۔ اہل تشیع کی نسبت سے گھر میں مجلس کا اہتمام بھی ہوتا تھا۔ جوانی میں ادب اور مشاہیر کی آپ بیتیاں، ان کے مطالعہ کا خصوصی محور و مرکز رہیں۔ تلاش حیات سے مقصد حیات تک کا یہ سفر تفصیلاً یوں طے کیا کہ علی سردار جعفری نے آغاز ہی میں انیس اور اقبال کے مطالعے سے زندگی کے بارے میں سوچنے اور زمین سے گہری وابستگی کا احساس لیا۔ گاندھی، نہرو اور لینن کی آپ بیتیاں پڑھیں۔

''......اور پھر لفظ بوژوا کے معنی کی تلاش۔ اور پھر یہ تلاش، تلاش حیات، نظریۂ حیات سے لے کر مقصد حیات تک پھیل گئی۔ جو دروازے گاندھی کی کتاب پڑھ کر نہرو کی تقریر سن کر ذرا ذرا کھلے تھے اور پھر بند ہو گئے تھے اس بار پورے کھل گئے۔ یورپ کا فاشزم اور ہندوستان کی تحریک آزادی کا احساس عرفان میں بدلنے لگا۔ مجاز، رشید جہاں، سجاد ظہیر، سبط حسن وغیرہ سے دوستی فکر و نظر میں ڈھلنے لگی''۔ ۵۰ؔ

علی سردار جعفری کی اردو غزل نئی زندگی کے نام پر دیے جانے والے دھوکے اور فریب کی قلعی کھول دیتی ہے اور زندگی کے جوش اور قوت کے ساتھ فرسودگی کو بھی ختم کرتی ہے اور زندگی کی رگوں میں حوصلہ و ہمت کا خون گرماتی ہے۔ وہ فریب خوردہ زندگی کو اس طرح ٹھکراتا ہے کہ

ؔ فریب دے کر حیات نو کا حیات ہی چھین لی ہے ہم سے
ہم اس زمانے کا کیا کریں گے اگر یہی ہے نیا زمانہ ۵۱ؔ

بدلتے ہوئے سماج کی مذمت اس طرح کی ہے

ؔ سکوں میسر جو ہو تو کیونکر، ہجوم رنج و محن وہی ہے
بدل گئے ہیں اگرچہ قاتل، نظامِ دار و رسن وہی ہے ۵۲ؔ

وہ اس تبدیلی میں بھی زندگی کی نئی تعبیر کے لیے کوشاں ہے۔

ع زندگی ہے تیز گام و نوجواں یہ بھی تو دیکھ ۵۳ؔ
ع خار و خس سے بن رہے ہیں گلستاں یہ بھی تو دیکھ ۵۴ؔ

علی سردار جعفری کے گھر کے ماحول نے حضرت امام حسینؓ کی دلیرانہ صداقت اور اس کے لیے جان کی بازی لگانے کے احساس کو تقویت پہنچائی۔ شاعر کو بھی بزم وطن میں وفاداری کے امتحان سے گزرنے کا مرحلہ درپیش ہے اور چارہ گر محض موت ثابت ہوئی۔

ؔ چارہ گر جانئے اس دور میں ہر قاتل کو
زندگی موت کو، اور درد کو درماں کہئے
کیجیئے کوچہ و بازار میں لاشوں کا شمار!
اور پھر ہند کو فردوس بداماں کہئے!!
اپنے ہر زخم کو اک پھول تصور کیجیے
سرخی خونِ عزیزاں کو بہاراں کہئے! ۵۵ؔ

''خون کی لکیر'' میں علی سردار جعفری نے ''موت اور زندگی'' کے نام سے ایک نظم کے آخری شعر میں موت و حیات کے باہمی تعلق کو پیش کیا ہے۔

ے موت جب آ کے کوئی شمع بجھا دیتی ہے
زندگی ایک کنول اور جلا دیتی ہے ۵۶

....

یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ کشمکش حیات میں حصہ نہ لینے والوں پر شکست خوردگی طاری ہو جاتی ہے اور وہ زندگی سے فرار کی راہیں تلاش کرنے لگتے ہیں۔ ان پناہ گاہوں میں ایک خیالی جنت بھی ہے جس میں رہ کر حقائق حیات سے نظریں چرانے کے خوگر ہو جاتے ہیں اور ایک طرح کی بے عملی کا شکار ہوتے ہیں۔ زندگی کے فطری پن سے دور ہونا اور عہد کے تقاضوں کا ساتھ نہ دینا وطیرہ بن جاتا ہے۔ ایک بے حسی اعصاب پر مسلط ہو جاتی ہے۔ جو موجود ہے اس سے بے بہرہ ہو کر، جو نہیں ہے، اس کے کھوکھلے پن سے زندگی کا مغز باقی نہیں رہتا۔ جاں نثار اختر کی شاعری میں

''......ہمیں زندگی کی حقیقتیں، مناظر کی دل فریبیاں، نفسیات کی باریکیاں اور رومان کی برنائیاں ملتی ہیں اور یہ سب چیزیں ایسی سموئی ہوئی ہیں جس طرح کوئی نباض موسیقی متعدد راگنیوں کو ملا کر ایک ایسا نغمۂ شیریں پیدا کرتا ہے کہ بزم پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے'' ۵۷

وہ زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہے اور زندگی کو براہ راست مخاطب کرتا ہے۔ جاں نثار اختر نے زندگی کو حدود ذات سے باہر نکل کر دیکھنے کا انداز اپنایا، نامساعد حالات میں بھی زندگی کا ہنر اور ''درد'' کو ''حیات'' بنانے کا گُر قائم رکھا۔

ے جینے کا ہمیں خود نہ ملا وقت تو کیا ہے
لوگوں کو سکھاتے رہے جینے کا ہنر ہم ۵۸

ے مار ہی ڈالے جو بے موت، یہ دنیا وہ ہے
ہم جو زندہ ہیں تو جینے کا ہنر رکھتے ہیں ۵۹

ے اپنے تاریک مکانوں سے تو باہر جھانکو
زندگی شمع لیے در پہ کھڑی ہے یارو ۶۰

ے زندگی یوں تو نہ بانہوں میں چلی آئے گی
غم دوراں کے ذرا ناز اٹھاؤ یارو ۶۱

ے ہر ایک غم کو خوشی کی طرح برتنا ہے
یہ دور وہ ہے کہ جینا بھی اک ہنر سا لگے ۶۲

ے جو درد زندگی کے لیے اذن مرگ ہو!!
اس درد کو حیات بنانے چلا تھا میں ۶۳

ے دل تباہ کا یہ حوصلہ بھی کیا کم ہے

ہر ایک درد سے جینے کی تاب مانگے ہے ۶۴ے

ے کتنا مشکل، کتنا کٹھن
جینے سے جینے کا ہنر ۶۵ے

....

جاں نثار اختؔر کی اردو غزل میں ''لاش'' موت کی مجسم تصویر ہے۔ ہر قدم پر زندگی کے رستے میں موت کا سامنا ہے۔

ے کس کی دہلیز پہ لے جا کے سجائیں اس کو
بیچ رستے میں کوئی لاش پڑی ہے یارو ۶۶ے

راز داں کو قتل کرنا، انسان کی درندگی کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ جب اپنے مفادات کی راہ میں رکاوٹ کا خطرہ ہو تو انسان کی جان بھی قابل احترام نہیں رہتی۔

ے اب مرے قتل کی تدبیر تو کرنی ہو گی
کون سا راز ہے تیرا جو چھپا ہے مجھ سے ۶۷ے

میت کا ادب اور رسوم وقواعد سے دفنانے کا عمل بھی زندگی کی بے حسی کی نذر ہو گیا ہے جس کی ایک تصویر یہ ہے۔

ے کوئی اتنا نہ ہو گا لاش بھی لے جا کے دفنا دے
انہیں سڑکوں پہ مر جائے گا انساں ہم نہ کہتے تھے ۶۸ے

ے کتنی لاشوں پہ ابھی تک
ایک چادر سی پڑی ہے ۶۹ے

....

فارغؔ کی گرفت فطرت پر بہت مضبوط ہے اس لیے قومی و بین الاقوامی حالات کے تناظر میں انسان دوستی کے نغمے الاپے ہیں۔ زبردست سیاسی وسماجی تبدیلیوں کے باوجود زندگی کا روشن پہلو فارغ بخاری کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ شاعر کے لیے تبدیلی کے محرکات بھی قابلِ غور ہیں اور اس کے اظہار کا حوصلہ بھی ہے۔ زندگی کے بہتے دھارے کی بے مقصدیت کی نفی جابجا ملتی ہے۔

> ''فارغ بخاری کی شاعری اردو دنیا کیلئے ایک ایسے علاقہ کی حسیت اور مائل بہ ترقی زندگی کا (SEISMOGRAPH) ہے جس کے مطالعہ سے وقت کا سفر قابل ادراک ہو جاتا ہے۔ زندگی کی حرکت اور جمود پس پشت قوتوں کی کارفرمائی پر سے پردہ اٹھ جاتا ہے اور یہ سب کچھ ایک آدمی کے قلب ونظر کی واردات کے توسط سے جو اپنی شاعری کے ''میں'' میں اپنے دور کے ''ہم'' کو سمیٹے ہوئے ملتا ہے...... فارغ کی شاعری سماجی وسیاسی حقیقتوں کی مزاج آشنا شاعری ہے اور یہ مخصوص طرز احساس اب ہماری زندگی کا اس قدر اہم عنصر بن چکا ہے کہ اس کی

عملداری میں ہمارے بہت ہی ذاتی لمحات بھی ذاتی نہیں رہ پاتے......''۷۰

زندگی کے سارے دروازے مقفل ہونے پر بھی وہ صدا لگا کر گزرنا پسند کرتا ہے۔ ہنگامۂ داروگیر میں بھی وہ زندگی کے خواب ضرور دیکھتا ہے۔ یہ خواب ذاتی بھی ہیں اور غیر ذاتی بھی۔ وہ اپنے عہد کی اطمینانی اور غیر اطمینانی صورت حال کا شارح ہے۔

ے زندگی میں ایسی کچھ طغیانیاں آتی رہیں
بہہ گئی ہیں، عمر بھر کی نیکیاں دریاؤں میں ۷۱

ے ہم تو اندھی راہوں پر دوگام نہیں چل سکتے
بے مقصد بھی جی لیتے ہیں لوگ نجانے کیسے ۷۲

ے کر دیا ہے تجربوں نے اس قدر کامل ہمیں
بن گئے ہیں زندگی کا مستقل منشور ہم ۷۳

فارغؔ نے دنیا کی ہر شے سے استفادہ کیا اور غزل کو زندگی کی انہی صداقتوں کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔محرومیوں سے جینے کی آگاہی پائی ہے۔ انسان چونکہ اس کائنات کا حصہ ہے اس لیے حیات سے بغاوت بھی ممکن نہیں۔ فارغ بخاری تجربے سے سیکھنے کے عمل کو جاری رکھتا ہے خواہ وہ تجربہ گناہ ہی کا کیوں نہ ہو۔

ے بھٹک کر ملا زندگی کا شعور
مری گمرہی رہنما بن گئی ۷۴

وہ زندگی کے کسی بھی منظر یا تجربے سے بے نیازانہ نہیں گزرتا۔ وہ ہر شخص کو عقیدے کی فکر میں دیکھتا ہے جبکہ فارغ کا مذہب صدق دل سے انسان بننے والے کو ''مومن'' کہتا ہے اور مذہب کی اصل اور روح یہ ہے کہ مایوسی گناہ ہے۔ وہ زندگی کے سارے باب بے کم و کاست لکھنا چاہتا ہے اس لیے اس نے عہد کی زندگی کے بیشتر موضوعات پر قلم اٹھایا۔ ان میں ایک موضوع زندگی کی مادیت کا بھی ہے۔

''فارغ کا شعور ایک ایسے سماجی انقلاب کا حامل ہے جو پوری شخصیت کو متوازن کرنے کے ساتھ ساتھ سماجی زندگی کے تمام مادی عیوب کو بھی دور کر سکے''۷۵

ے ہم نکل آئے ہیں بازاروں میں
جیب میں ڈال کر کردار اپنے ۷۶

ے یہ بھوک ہی تو ہے قاتل میرے عقاید کی
مہ صیام! میں کیونکر گلے لگاؤں تجھے ۷۷

ے بچا بچا کے کہاں تک اسے رکھیں فارغ
سفید پوشی بھی اس دور میں مصیبت ہے ۷۸

ان اشعار کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ

''فارغ بخاری نے بھی اپنے عہد کے اس المیہ کو محسوس کیا ہے کہ ماحول کی تیز رفتاری کے عمل نے اشیاء کی مسافت اور ہئیت کو، عمل کی تمام تدبیروں اور پیش بندیوں کو اور فکر کے تمام سانچوں اور خطوط کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے لیکن وہ اس سارے پروسیس کو وجدان کے بل پر نہیں بلکہ ٹھوس اور مادی دنیا کی ان زندہ حقیقتوں کے حوالے سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش اور کاوش کرتے ہیں جو لمحۂ موجود کی گرفت کا واحد ذریعہ ہیں''۷۹ے

فارغ بخاری کی اردو غزل میں موت محض ایک تاثر نہیں بلکہ زندگی کا تجزیہ کرنے کا عمل بھی ہے اور ایک پیغام بھی۔ سراغ حیات پانے والا موت کا شکار نہیں ہوتا۔ اس کے ہاں قتل و خون کے واقعات سیاسی تعلقات اور رشتوں سے پیوست ہیں۔

ے وہ دور فنا نصیب سمجھو
انساں کا لہو بنے حنا جب ۸۰ے

ے اپنے لہو سے دھوکے ہی اجلا بنے گا تن
پیغمبری کا راز تو قربانیوں میں ہے ۸۱ے

ے کہاں ہے گردش دوراں کدھر ہے سیل حوادث
سکون مرگ مسلسل میں ڈوبنے لگی ناؤ ۸۲ے

ے چلو فارغ شہادت گاہ عالم سے بھی ہو آئیں
بغیر اس کے کوئی بھی صاحب ایماں نہیں ہوتا ۸۳ے

ے ہو مژدہ اہلِ چمن جانثار لوٹ آئے
حریمِ زلف سے پھر سوئے دار لوٹ آئے ۸۴ے

....

مجروحؔ سلطان پوری کی اردو غزل تہہ در تہہ زندگی کی معنویت کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ مجروح کے عہد میں زندگی کے مسائل کو شعر میں بیان کرنا ہی کافی نہ سمجھا جاتا تھا بلکہ زندگی کے ایک واضح مقصد کو اس صنف میں اس طرح پیش کرنے کا مسئلہ تھا کہ تغزل کا وصف بھی قائم رہے۔ عہد خلفشار میں مجروح نے آنے والے دور کی آواز سنی ہے اور بے سکونی کے دور میں غزل کے ذریعے تہذیبی اقدار کو بچانے اور سنبھالنے کی سعی کی ہے۔

ایک مسلسل غزل اس کی نمائندگی کرتی ہے:

ے جب ہوا عرفاں تو غم آرام جاں بنتا گیا
سوز جاناں دل میں سوز دیگراں بنتا گیا
رفتہ رفتہ منقلب ہوتی گئی رسم چمن!

دھیرے دھیرے نغمۂ دل بھی فغاں بنتا گیا
میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے، اور کارواں بنتا گیا
میں تو جب جانوں کہ بھر دے ساغر ہر خاص و عام
یوں تو جو آیا وہی پیر مغاں بنتا گیا
جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایانِ شوق
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا
شرحِ غم تو مختصر ہوتی گئی اس کے حضور
لفظ جو منہ سے نہ نکلا داستاں بنتا گیا
دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا ۸۵

ان اشعار میں روایت کا احترام و پاسداری بھی ہے اور روایت کی توسیع کا عمل بھی جاری ہے۔ یہ غزل مجروح کے انفرادی و اجتماعی تصور حیات کا ایک خوبصورت امتزاج بھی ہے۔

''......بڑا کارنامہ اس غزل کا یہ ہے کہ اس میں انفرادی شعور کی جگہ اجتماعی شعور نے لے لی ہے۔ ادب اگر دائمی اقدار کا حامل ہے تو زندگی بھی دائمی اقدار کی حامل ہے اور اس ادب کو جو زندگی کی دائمی قدروں کو اپنے اندر سمو لے ''مقصدی ادب'' کہہ کر اسے گردن زونی قرار دینا غیر علمی اور غیر عملی تنقید ہی کا رویہ ہوسکتا ہے۔ مجروح کے مذکورہ اشعار جو غزل کو اجتماعی شعور سے آشنا کر رہے ہیں اسے اس کیفیت سے بھی لبریز کر رہے ہیں جس سے قاری کا وجدان بھی لذت اندوز ہو رہا ہے اور یہ مختصر سی غزل زندگی کی ابدی حقیقت کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں ادب کی اس حقیقت سے بھی روشناس کر رہی ہے'' ۸۶

مجروحؔ کی اس غزل میں خیال اور جذبے کی آمیزش سے بھرپور زندگی کے کئی رنگ ملتے ہیں۔ جو اپنے عہد کے تاریک دنوں میں آنے والی زندگی کی خوش خبری بھی دیتی ہے۔ مجروح کا خیال ہے کہ تقدیر کا شکوہ وہ لوگ کرتے ہیں جو جینا نہیں چاہتے۔ کوئی شخص اتنا مجبور نہیں کہ آپ اپنا مقدر نہ بن سکے۔

....

زندگی اور موت کی فراوانی کا انحصار بھی انسان کے جذبوں اور صلاحیتوں پر ہے۔

اپنی اپنی ہمت ہے، اپنا اپنا دل مجروح
زندگی بھی ارزاں ہے، موت بھی فراواں ہے ۸۷

ے یہی جہاں ہے جہنم، یہی جہاں فردوس
بتاؤ عالمِ بالا کے سیر بینوں کو ۸۸؎

وہ عالمِ بالا میں کسی اور زندگی کے انتظار میں نہیں ہے۔ اس کے لیے زندگی کی کشاکش ہی سب کچھ ہے۔ سعیِ ناتمام میں زندگی کا لطف ہے۔ انسان اپنی کوشش اور تدبیر سے اسی جہان رنگ و بو کو جہنم یا فردوس میں تبدیل کر سکتا ہے۔ یہی زمین اور دھرتی اس کے مستقبل کے خوابوں کی تعبیر ہے۔ ''آہ جاں سوز'' میں بھی وہ موت کی طرف نہیں زندگی کی طرف دوڑتا ہے اور جینے کی کوئی تدبیر سوچتا ہے۔

ے آہِ جاں سوز کی محرومیِ تاثیر نہ دیکھ
ہو ہی جائے گی کوئی جینے کی تدبیر نہ دیکھ
یہ ذرا دور پہ منزل، یہ اجالا، یہ سکوں
خواب کو دیکھ ابھی خواب کی تعبیر نہ دیکھ ۸۹؎

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان شعرا کے ہاں جبر و تشدد، خوں ریزی، بے یقینی، عدم استحکام، سماجی ناانصافی، بے آبروئی، خوف، دہشت، اضطراب و انتشار، درد و غم، محرومی اور تنہائی کے فکر انگیز پہلو زندگی اور موت کی آویزشوں میں اردو غزل کا موضوع بن گئے۔ زندگی اور موت کو نئے نئے انداز میں دیکھنے کا رجحان پیدا ہوا۔ موت اب صرف طبعی نہیں رہی بلکہ اس کے اسباب بھی تبدیل ہو گئے۔ زندگی گزارنے کے ڈھنگ بدل گئے۔ فرد کی زندگی اور موت کے حوالے سے احساس اور شعور کے نئے پیکر ابھرے اور ان شعرا نے عصری زندگی کی پریشانیوں کو ایک نئی حسیّت کے ساتھ اپنے اپنے انداز میں پیش کیا۔

حوالہ جات:

۱۔ پروفیسر محمد حسن ''غزل کا تخلیقی سفر'' مضمون مشمولہ **معاصر اردو غزل، مسائل و میلانات** (مرتبہ) پروفیسر قمر رئیس اردو اکادمی دہلی ۲۰۰۱، ص ۱۵

۲۔ فیض، **نسخہ ہائے وفا (نقش فریادی)** مکتبہ کارواں، لاہور، سنہ ندارد، ص ۲۹

۳۔ فیض، **نسخہ ہائے وفا (میرے دل، میرے مسافر)** مکتبہ کارواں لاہور، سنہ ندارد، ص ۲۶ (**نسخہ ہائے وفا**، ص ۶۱۴)

۴۔ فیض، **دست صبا** (ابتدائیہ) مشمولہ **نسخہ ہائے وفا**، ص ۸/۱۰۴

۵۔ سابق میجر محمد اسحاق، روداد قفس (**زنداں نامہ** کا دیباچہ مشمولہ **نسخہ ہائے وفا**) ص ۲۲۵ (زنداں نامہ، ص ۳۵)

۶۔ فیض، نقش فریادی مشمولہ **نسخہ ہائے وفا**، ص ۱۹/نسخہ...... ۲۵

۷۔ فیض، نقش فریادی مشمولہ **مرے دل مرے مسافر**، ص ۳۹ (نسخہ......ص ۶۲۷)

۸۔ فیض، نقش فریادی مشمولہ **غبار ایام**، ص ۱۹ (نسخہ ہائے وفا، ص ۶۸۷)

۹۔ ایضاً، ص ۳۲ (**نسخہ ہائے وفا**، ص ۷۰۰)

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۴، (**نسخہ ہائے وفا**، ص ۷۰۲)

۱۱۔ بحوالہ بیگم ایلس فیض، فیض احمد فیض مشمولہ (فیض نمبر) **فکر نو**، بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

۱۲۔ فیض، دست صبا (مشمولہ **نسخہ ہائے وفا**) ص ۳۹ (**نسخہ ہائے وفا**، ص ۱۳۵)

۱۳۔ نعمت الحق، ''فیض کا نظریۂ فن'' مشمولہ فکرِ نو (فیض نمبر) ص ۷۵

۱۴۔ فیض، دست صبا مشمولہ **نسخہ ہائے وفا** فیض نمبر ص ۲۳ (نسخہ ہائے وفا، ص ۱۱۹)

۱۵۔ سید سبط حسن، فیض کا آدرش مشمولہ **فیض احمد فیض، تنقیدی جائزہ**، مرتبہ: خلیق انجم، فکشن ہاؤس، لاہور ۱۹۹۱ء ص ۱۲۱

۱۶۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ''اردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ'' الوقار پبلی کیشنز، لاہو، ر ۲۰۰۷ء، ص ۶۴

۱۷۔ فیض، زنداں نامہ مشمولہ **نسخہ ہائے وفا**، ۴۶/۲۳۶

۱۸۔ ایضاً، ۶۵/۶۵۵

۱۹۔ ایضاً، ۷۱/۲۶۱

۲۰۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد عارف ''فیض احمد فیض : رومان اور شاعری''، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور ۲۰۱۰ء، ص ۱۶۵

۲۱۔ فیض، سر وادی سینا مشمولہ **نسخہ ہائے وفا**، ص ۶۱/۴۳۱

۲۲۔ سحر انصاری (مترجم) ایک حوصلہ مند دل کی آواز (از الیگزانڈر سرکوف) مشمولہ سر وادی سینا، نسخہ ہائے وفا، ص ۱۸/ ۳۸۸

۲۳۔ فیض، شامِ شہر یاراں مشمولہ **نسخہ ہائے وفا**، ص ۶۴ / ۵۳۸

۲۴۔ فیض، غبارِ ایام مشمولہ **نسخہ ہائے وفا**، ص ۳۴/۷۰۲

۲۵۔ ایضاً، ص ۳۲/ ۷۰۰

۲۶۔ فتح محمد ملک ''فیض احمد فیض: برہم نوجوان کا المیہ'' مشمولہ **تحسین و تردید**، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء لاہور، ص ۱۱۶۔۱۱۵

۲۷۔ حمیدہ سالم ''جگن بھیا'' مشمولہ **کلیات مجاز**، کتابی دنیا، دہلی ۶، ۲۰۰۳، ص ۳۱

۲۸ اسرار الحق مجاز، **شب تاب**، ہندوستانی پبلشرز، دلی، ۱۹۴۵ء، ص ۱۲۱
۲۹ ڈاکٹر محمد حسن، ''گلِ نغمہ'' (مجاز کے متعلق میری ڈائری کے چند اقتباسات) مشمولہ **کلیات مجاؔز**، ص ۱۱
۳۰ عصمت چغتائی ''عشقِ مجازی'' مشمولہ **کلیات مجاؔز**، ص ۶۷، ۶۶
۳۱ اسرار الحق مجاز، **شب تاب**، ص ۱۴۹۔ ۳۲ ایضاً ص ۱۷۳
۳۳ سید احتشام حسین مجاز، ''فکر وفن کے چند پہلو'' مشمولہ **علی گڑھ میگزین** (علی گڑھ کے مغنی آتش نفس مجاؔز مرحوم کی یاد میں) اشاعت ۵۶۔۱۹۵۵ء
۳۴ اسرار الحق مجاؔز، **کلیات مجاؔز**، ص ۲۲۲
۳۵ پروفیسر ڈاکٹر نعیم نقوی، ''اسرار الحق مجاز'' مشمولہ **تنقید و آگہی**، غضنفر اکیڈمی، کراچی، سنہ ندارد، ص ۳۶۲
۳۶ فیض احمد فیض، دیباچہ مشمولہ **آہنگ** (اسرار الحق مجاؔز) آزاد کتاب گھر، کلاں محل، بار دوم، دہلی، ص ۱۵
۳۷ اسرار الحق مجاز، **ساز نو**، کتابی دنیا، لکھنؤ، سنہ ندارد، ص ۲۸
۳۸ اسرار الحق مجاز، ''شب تاب'' ص
۳۹ پروفیسر ممتاز حسین، ''مجاز کی موت پر'' مشمولہ **ادب اور شعور**، فضلی سنز، کراچی، ۱۹۹۲ء، ص ۲۴۶
۴۰ معین احسن جذؔبی، **سخن مختصر**، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۶۰ء (ص درج نہیں ۱۹۵۸ء)
۴۱ معین احسن جذؔبی، **سخن مختصر**، (ص درج نہیں ۱۹۵۹ء)
۴۲ ایضاً ص ۲۰ (دسمبر ۱۹۵۰ء) ۴۳ ایضاً ص ۲۲ (دسمبر ۱۹۵۰ء)
۴۴ ایضاً ص نمبر درج نہیں (۱۹۵۲ء)
۴۵ وارث کرمانی ''معین احسن جذبی'' مشمولہ **افکار و انشا**، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۳ء، ص ۴۱۔۴۰
۴۶ معین احسن جذؔبی، سخن مختصر (۱۹۵۷ء)
۴۷ ایضاً (ص نمبر درج نہیں، ۱۹۵۸ء)
۴۸ ڈاکٹر سید عبد الباری، ''معین احسن جذبی: اپنی فکر وفن کی دنیا میں'' مشمولہ **افکار تاز** (مجموعہ مقالات) بھارت آفسٹ پریس، دہلی، ۱۹۹۷ء، ص ۱۶۰
۴۹ معین ...... سخن مختصر، ص ۱۱
۵۰ علی احمد فاطمی، مقدمہ، مشمولہ **کلیات علی سردار جعفری**، جلد اول: شاعری (مرتبہ: علی احمد فاطمی) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۶
۵۱ علی سردار جعفری، **کلیات علی سردار جعفری**، جلد اول (حصہ شاعری) ص ۴۲۰
۵۲ ایضاً، ص ۴۱۴ ۵۳ ایضاً، ص ۳۹۱ (یہ مصرع غزل نما نظم کا ہیئتی تجربہ)
۵۴ ایضاً، ص ۳۹۱ ۵۵ ایضاً، ص ۴۲۲
۵۶ ایضاً، ص ۳۲۵
۵۷ جوش ملیح آبادی، پیش لفظ، مشمولہ **سلاسل** از جاں نثار اختر المسلم پبلشرز، کراچی، ۱۹۹۲ء، ص ۱۳۶
۵۸ جاں نثار اخؔتر، سلاسل، ص ۲۶۷ ۵۹ ایضاً، ص ۲۷۴

۶۰ ایضاً،ص۲۸۴ ۶۱ ایضاً،ص۲۸۸

۶۲ جاں نثار اختر، سکوتِ شب مشمولہ **کلیات**،ص ۳۱۸

۶۳ جاں نثار اختر، خاکِ دل مشمولہ **کلیات**،ص ۳۲۹

۶۴ جاں نثار اختر، تار گریباں مشمولہ **کلیات**،ص۴۷۴

۶۵ جاں نثار اختر، تار گریباں مشمولہ **کلیات**،ص۴۸۰

۶۶ جاں نثار اختر، سکوتِ شب مشمولہ **کلیات**،ص۲۸۴

۶۷ ایضاً،ص۳۰۰ ۶۸ ایضاً،ص۳۲۱

۶۹ جاں نثار اختر، تارِ گریباں مشمولہ **کلیات**،ص۴۸۴

۷۰ محمد علی صدیقی، ''خوشبو کا سفر۔فن اور زندگی کی کہانی'' مشمولہ **خوشبو کا سفر از فارغ بخاری**، فنون پبلشرز، لاہور، ۱۹۷۸ء،ص۱۷

۷۱ فارغ بخاری، **شیشے کے پیرہن**، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۷۱ء،ص۳۰

۷۲ ایضاً،ص ۴۷ ۷۳ ایضاً،ص۸۰

۷۴ فارغ بخاری، **خوشبو کا سفر**،ص۸۰

۷۵ ممتاز حسین (دیباچہ) مشمولہ **زیروبم** (از فارغ بخاری) گوشہ ادب، لاہور،۱۹۵۲ءص۱۲

۷۶ فارغ بخاری، **شیشے کے پیرہن**،ص۳۴

۷۷ ایضاً،ص۴۷

۷۸ فارغ بخاری، **خوشبو کا سفر**،ص۱۴۲

۷۹ عتیق احمد، فارغ بخاری کی شاعری اور فن، مشمولہ **استفادہ**، مکتبہ ارژنگ، پشاور، ۱۹۸۱ء،ص۱۲۲

۸۰ فارغ بخاری، **خوشبو کا سفر**،ص ۱۲۷

۸۱ ایضاً،ص ۱۲۶

۸۲ فارغ بخاری، **زیروبم**،ص۶۴

۸۳ فارغ بخاری، **آئینے صدائوں کے**، کتابیات، ۱۹۸۵ء،ص ۲۷

۸۴ فارغ بخاری، **پیاسے ہاتھ**، آئینہ ادب، لاہور،۱۹۸۲ء،ص ۱۲۷

۸۵ مجروح سلطان پوری، **کلیات مجروح سلطان پوری** (مرتبہ: تاج سعید)،الحمد پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۳،ص ۹۵،۹۶

۸۶ پروفیسر جگن ناتھ آزاد ''مجروح کی غزل''،مشمولہ **کلیات مجروح سلطان پوری**، مرتب: تاج سعید، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء،ص۲۲

۸۷ مجروح سلطان پوری، **کلیات مجروح**،ص ۸۸

۸۸ ایضاً،ص۹۴ ۸۹ ایضاً،ص ۹۱